

ناولٹ

تصام هو الانتظار هو صبری

تہنیت علیہ الرحمات



”وہی بھی گئی دورانی زندگی ہے۔۔۔۔۔ دیکھی ہی رواں آگے، بڑھتی جاتی ہے اور گھر جا کر لوں گے گا گویا وقت ساکن ہو گیا ہے ہر حرکت معدوم ہوئی ہے، زندگی فریز ہو چکی ہے بس ایک سانس جاری ہیں۔۔۔۔۔ دل کی رفتار نہیں سمجھی۔۔۔۔۔ آنکھوں نے برسا اور دماغ نے سوچنا اور کڑھنا نہیں چھوڑا۔“ وہ پھر سے سوچوں کے ساتھ جو پرداز ہوئے۔

”چلیں لی بی۔۔۔۔۔ آپ کا اسٹاپ آگیا۔۔۔۔۔ سکنڈ ہینڈ کی تیرا آواز پر وہ فوراً سے چیخ کر کھڑی ہوئی اور بس کرکتے ہی اتر گئی۔

چند قدم چلنے کے بعد ہی اس کی گلی آگئی اور دائیں طرف۔ اس کے گھر کا نمبر چوتھا تھا۔

حسب معمول دوسری دسک پر ہی دروازہ کھل گیا۔ ”السلام علیکم ای“ اس نے حتی الامکان اپنے لیے ہی حتمن چسپائی۔

”وہاں بیچیم السلام“ انہوں نے اس کے آگے ہوتے ہی دروازہ بند کیا اور اس کے پیچھے چلی آئیں۔ ”آج بہت دیر کر دی تم نے۔۔۔۔۔ باپ چل میں خیریت بھی ناں! فرخ کیسی بھی اب؟“ وہی معمول کے سوال تھے جو وہ اس کے آتے ہی کیا کرتی تھیں روزانہ۔۔۔۔۔ ملا ناغہ۔

”ای۔۔۔۔۔ آپ پانچ دس منٹ کی تاخیر سے پریشان مت ہو جایا کریں نہیں ہمارے نام کے حساب سے نہیں چلتیں بلکہ ہمیں ان کے آنے جانے کے وقت کے مطابق چلنا پڑتا ہے۔ آج بھی بس نے بہت انتظار کر دیا مجھے۔“ شانزہ نے چادر تار کر پکھے کے نیچے بیٹھنے ہوئے کہا۔

”ہاں بیٹی جانتی ہوں سب گھر اس دل کا کیا کروں؟ ایک ایک کو۔۔۔۔۔ سو سو سو میں مبتلا کرنے لگتا ہے۔۔۔۔۔ دل گویا آتھیں میں الجھ جاتا ہے کسی میں قرار بھی نہیں ملتا۔ ہاں کا دل بھی رب نے اندیشوں اور خدشوں کی مٹی سے بنایا ہے شاید۔“ وہ گھر اس سب بھر کر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ ”فرخ کچا کیا حال ہے؟“

”ٹھیک تھی۔“ شانزہ نے ماں کا شکر چہرہ دیکھا۔ ”ای پلڑ آپ خود کو سنبھالیں ورنہ میں اور میرا

لوں کے پیالے بھر بھر منہ پر انڈیل رہی تھی۔

”آج شانزہ۔“ امی نے جن سے نکلے ہوئے بلایا اور سائیڈ اسٹینڈ سے تو لیا کھج کر چہرہ چسپائی ہوئی ڈانٹنگ لہجے کی طرف آگئی۔

چار بیڑروں کا کافی کشادہ گھر تھا جو اب نے اچھے لوں میں بھی ”کافی“ کھج تان کر بنوایا تھا۔ حق حلال کی کمانی تھی۔ گزرا ہوا جاتا تھا مگر ”مستقبل“ کے لیے کچھ ہمارا حال تھا۔۔۔۔۔ اپنی خاندانی وراثت میں ملنے والا اثاثہ امی انہوں نے اسی گھر پر خرچ کر دیا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پلاٹ ان کے درے میں آیا تھا۔ یہ گھر بہن کا تھا۔

بچن کے دروازے کے ساتھ ہی ڈانٹنگ ٹیبل رکھی تھی اور باقی کا کمرانی وی لاؤنچ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ بالکل سامنے والی دیوار کے ساتھ بی وی ریک لگا ہوا تھا اور دونوں جانب صوفہ چیرز اور سینئر ٹیبل۔۔۔۔۔ سادگی اور تانسب سامان و آرائش کی وجہ سے ان کا گھر کھلا کھلا اور کافی کشادہ لگتا تھا۔

”آج رحمت لی بی آئی تھی؟“ کھانے کے دوران اس نے کام والی ماسی کا پوچھا۔

”ہاں بہنہارے نکلنے کے ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی آئی تھی۔ اسی سے سبزی منگوائی تھی آج۔ بیاز بالکل ختم ہوئی تھی۔ سامن کیسے بننا؟ اور شانزہ میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ روزانہ اسی سے منگوا کر لوں گی سو دسلف دودھ دیکھو جو بھی۔۔۔۔۔“ انہوں نے انہماک سے کھانا کھاتی بیٹی کو دیکھا جس پر قسمت کی ستم ظریفی سے ایک ساتھ بہت سادگی ڈتے دار پاں آن پڑی تھیں۔ گھر کے باہر کی اور اندری۔ چھوٹی بڑی تمام ضروریات کا خیال رکھنا اور پھر باب۔۔۔۔۔ وہ دن بھر کی مشقت سے تڑپا ہوا ہو جایا کرتی تھی مگر ماں پر ظاہر نہیں ہونے دیتی تھی مگر ماں کا دل تو وہ دیکھنا نظر رکھتا ہے جو اولاد کے چہرے پر عکس ہے نام اداسی اور ہلکی سی شکایتیں بھی دیکھ لیتا ہے۔ ہر ان کی سن لیتا ہے اور ہر ان کی پڑھ لیتا ہے۔

”ٹھیک ہے امی، بس ذرا دھیان رکھنے کا پیو یوں میں ڈیڑی نہ مار دیا کرے۔ پہلے ہی کافی سے زیادہ

ضرورت مند رہتی ہے وہ۔“ شانزہ نے خلاف عادت خاموشی سے کہا۔ ماسی کے ذکر کے ساتھ ہی اس کا حلق تنک کر دوا ہو گیا تھا۔ وہ تو کھجائی کی نرم دلی اور کھجاس کی مٹھیں سا جھٹس ہیں کہ وہ اسے ابھی تک گھر میں آنے دے رہی تھی۔ کافی پرانی ملازمت تھی۔ جزدنی آئی اور کام کر کے چلی جاتی تھی۔ کبھی کبھار کام کی زیادتی ہوئی یا ضرورت تو اسے بلوایا جاتا تھا تب وہ آ جاتی تھی اس کا گھر اس ایریا کے قریب ہی واقع غریب بستی میں تھا اس لیے آنا جانا بغیر خرچ کے تھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ آج بھی گمن کر پورے پیسے دیے تھے اسے۔“ امی نے اس کی بات کا تائید کی اور گھر اس سب بھر کر رہ گئیں۔ ”مجھوڑی انسان کو بہت بے بس کر دیتی ہے بیٹی اور وہ تمام عمر اسی دائرہ عمل میں چکرانا دیتا ہے بالآخر تو اسے ٹھکانا ہوتا ہے نا! کہیں نہ کہیں تو ٹھہر کر دوسری سانس بھال کرنا پڑتی ہے ناں! اور بیٹی قسمت کے لکھے کا دوش ہم اسباب پر کیوں ڈالیں۔۔۔۔۔ وہ بھی تو ایک طرح سے اپنی قسمت کے ہی تابع ہے یہ ان کی قسمت وہ ہماری قسمت۔“ بولتے بولتے ان کے لہجے میں حتمن سٹ آئی تھی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ امی ٹھیک کہا آپ نے اپنے نصیبوں کے بکاڑ کا کسی اور کو ڈتے دار کہنا کہاں کا انصاف ہے بھلا۔“ اس نے چند نوالے لے کر ہاتھ روک دیا۔ حالانکہ کھانا سامنے آنے سے پہلے تک اسے بھوک کا احساس نہیں ہو رہا تھا مگر امی کے ہاتھ کا بنا سامن روٹی آگے آتے ہی وہ مردہ بھوک جاگ اٹھی تھی جو صبح سے اس کے اندر کہیں کونے کھدے میں چھپی ہوئی تھی۔ اسکول میں بھی کچھ نام نہاد کا بیاس چپک کرنے میں گزار آئی تھی کچھ کھانے پینے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

”ارے، یہ ایک روٹی تو ختم کرو۔“ امی نے اسے اٹھتے دیکھ کر ردکا۔

”بس امی پیٹ بھر گیا“ سامن بہت مزے کا بنا تھا آج۔ وہ دواش تین کی طرف بڑھ گئی تو امی نے ٹرے اٹھالی۔

”ہاں یاد آیا امی، کل آپ فرخ کے لیے کھانا بنا کر

رکھنے کا میں اسکول سے سیدھی گھر آؤں گی پھر ہا چیل جاؤں گی۔“

”اچھا.....“ وہ دیکھ کے دروازے کے پاس ہی رک گئیں۔ ”کل میں بھی چلوں گی فرح کے پاس کافی دنوں سے نہیں دیکھا ہے..... ٹھیک ہے شانزہ۔“

”ٹھیک ہے اسی۔“ وہ ہاتھ نہ دھو کر اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے یونی اور امی نے تاسف و محبت سے اسے دیکھا۔

”کننی! نگاہانی آپ ذی ہے اس پر اپنی کم عمری میں اور کتنی بہادر اور دوسلے والے ہے میری بیٹی اپنے دل کو ہر دکھ پہننے کے لیے بڑا کر رکھا ہے..... محبتوں سے لبریز اور دیکھوں کہ جذب کرنے والا۔“

DECEMBER.2004 PAKEEZA 212

اس نے بلی تھی جو اس کی شخصیت کا خامہ تھا مگر دنیا کی
انگاری طرف دیکھا۔
”ہونہ..... یہ بھی کیا سمجھیں ہے دوستی کا
دوری فی..... دن اور رات کہیں یا چاند اور کالی
رات۔“ سبجرائے مسکراہٹ سے ان کے ہنسون کی
تراجاں میں شجر میڑ جاہل آ گیا تھا۔ جس نگاراستف سے
دیکھتے ہوئے شخص سر ہلا کر رہ گیا۔

☆☆☆

خوشی اور غم کا فلفلہ بھی کتنا عجیب ہے!
کہ
یہ دونوں آگ اور پانی
یا کہ

DECEMBER 2004 (D) PAKISTAN 213

طرح کے متوسط اور سفید پوش گھرانے والے تھے۔

”ارے آپ! آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ فرح بیٹی تو اس گھر میں راج کرے گی راج۔ اظہر بہت اچھا لڑکا ہے۔ ماشاء اللہ سے اتنی اچھی تو اس کی نوکری ہے پھر باپ کی چھوڑی ہوئی جائیداد بھی خوب ہے۔ بس دو ہی تو بھائی ہیں، بہنیں بیاہی گئیں۔“ رشید کرانے والی نے تسلی کراتے ہوئے کہا۔ امی بے چاری اکیلے فیصلے کی اس کمزری میں شش و پنج میں مبتلا ہو گئیں۔ بھائیوں سے تو مشورہ کیا تھا اور انہوں نے اظہر کے بارے میں معلومات کروا کر تسلی بخش رپورٹ دی تھی۔ اپنے جینے بھٹانی سے بھی صلاح کی تھی۔ وہ لوگ بھی مطمئن تھے۔ اور یوں فرح کی شادی اظہر سے طے ہو گئی۔

شانزہ ان دنوں میٹرک میں تھی اور عادل نے انٹرکا امتحان دیا تھا۔ اور اب کسی چھوٹی موٹی نوکری کی تلاش میں تھا۔ اوپر کا پورشن کرائے پر چڑھا ہوا تھا۔ جبکہ ایک دکان کا کرایہ تو کافی عرصے سے آمدنی کا ذریعہ تھا ہی۔ فرح کی شادی مناسب طریقے سے ہو گئی۔ ماموؤں اور تایا نے اس موقع پر امی کا بڑا ساتھ دیا۔ ان کی ڈھارس بندھائے رکھی اور فرح کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھ کر اسے رخصت کیا۔

وقت کا پہلا گھومتا رہا۔ زندگی اس کے ساتھ خوش سفر تھی۔ زندگی جو کل بھی تھی اور آج بھی ہے۔ کل بھی رہے گی یوں ہی۔۔۔ زندگی پرانی بھی ہے اور نئی بھی۔۔۔ جو جوان بھی ہے اور بوڑھی بھی۔ جدید بھی ہے اور قدیم بھی۔۔۔ زندگی مسلسل سفر کا نام ہے اور اسی سفر پر چلتے چلتے ایک دن انکشاف ہوا کہ فرح جو اب تک ماں کے سامنے اپنی سرائی والوں کا اور اپنی خوشگوار زندگی کا بھرم قائم رکھے ہوئے تھی وہ بھوٹا تھا۔ بیوہ ماں کو دیکھی نہ کرنے کا ڈراما تھا۔ بہن اور بھائی کے مستقبل پر کوئی تدبیر نہ لگنے کے لیے محض دکھاوا تھا۔ وہ دو سالوں سے ذہنی اذیتوں اور جسمانی تشدد کی بھٹی میں جھل رہی تھی۔ اس کا شوہر قدرتی طور پر موجود اپنے اندر کی ”مردمی“ کا بدلہ اس سے لیتا رہا تھا۔ اس کی ساس جو اس ”راز“ سے ناواقف تھی وہ بھی انجانے میں اسے ہی عتاب کا نشانہ

بنائے ہوئے تھی۔ وہ بے چاری مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی ملزم بنادی گئی تھی۔ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی قصور وار ٹھہرائی جا رہی تھی۔ اور وہ یہ سب بھی سہہ رہی تھی اور اس کی یہ مظلوم بیٹی آئندہ کے لیے بھی خود کو اسی آگ میں جلائے کے لیے تیار تھی۔۔۔۔۔ مگر آدم کے بیٹے کے اس کراہیت زدہ کردار کا وہ تعفن بھرا روپ برداشت تھا۔ کسی بھی صورت کسی بھی قیمت!

”دیکھو۔۔۔ فرح یہ بہت ضروری ہے۔۔۔۔۔ میں اظہر سے بات کر چکا ہوں وہ بھائی ہے میرا، میری چھوڑی ہے سمجھتا ہے اور پھر باپ تو ایک ہی ہے۔۔۔۔۔ وہ یا میں اس طرح میری ذات کا بھرم بھی رہ جائے گا اور اماں کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔“ اور وہ آنکھیں پھاڑے اس کو شہ پست کے بنے ”بت“ کو دیکھنے لگی جو انسانیت کے نام پر بہت بڑا بد نما داغ تھا۔۔۔۔۔ اس کے اندر انتہاؤں کو ہلاک کرنے کا طوفان اٹھنے لگا۔ دل و دماغ میں سامنے کھڑے شخص کے لیے سوائے نفرت اور کراہیت کے کوئی ہلہ باقی نہیں رہا تھا۔ وہ دم توڑتی محبت اچانک ہی اپنی آپ مر گئی جو بڑی مشکلوں سے اب تک اس نے اپنے دل میں سنہال کر رکھی تھی۔

ایک خیر انگارہ نگاہ اس پر ڈال کر اس نے منہ پھیر لیا۔ اسے بہت بری طرح اس سے گھن آنے لگی تھی۔ ”اے۔۔۔۔۔ میری بات سن لی ہے ناں! تم آج رات۔۔۔۔۔ اماں اپنے بھائی کے گھر جا رہی ہیں اور میں کوئی بہانہ بنا کر اپنے کسی دوست کے ہاں نکل جاؤں۔ تم تیار رہنا۔“ اظہر نے اس کا بازو اپنے ہاتھ میں دبوچ کر ایک جھکے سے اپنی طرف موڑا۔

”بے غیرت۔۔۔۔۔ بے خیا۔۔۔۔۔ فرح نے ایک نفرت بھری نگاہ بھی نہ ڈالی اس پر اور دل ہی دل میں ہر آیا اسے سنایا۔“ کہاں ہے اس قابل یہ شخص کے اس کے سامنے لفظوں کی حرمت کھوئی جائے۔۔۔۔۔ جسے رشتوں کی پاکیزگی کا پاس نہیں، انسانیت کے تقدس کا خیال نہیں، عزت و مردانگی کی پروا نہیں وہ لفظوں کی حرمت کو جانے! جسے عورت کی عزت نفس اور وقار کی دھجیاں بکھیرا آجائے وہ تحفظ کی وقعت کیا سمجھے؟“ اس نے حد درجہ

”بوہہ..... ظالم مرد کا کزور ہتھیار صرف عورت پر ہی استعمال ہوتا ہے یوی کو طلاق کی دھمکی دے کر اس کی عزت و حیثیت خرید جائے ہو۔“ میرا وقار اتنا سستا ہر نہیں ہے اظہر صاحب..... اب میں ایک لمحہ بھی تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی اب مجھے مزید ایک دن بھی تمہاری یوی بھلوانا کوار نہیں..... عورت کا اختیار محدود ہے مگر فیصلہ کی قوت اس ہوتی ہے۔ یہ تم اب جالو سے عورت جسانی طور پر کزور دیکھی مگر اس کے ارادوں کی مدد ملی کا قصور تم جیسا بڑوں اور کزور شخص بھی نہیں کر سکتا..... شوکتی ہوں میں ایسی رفاقت پر جو میری اور انجی عزت کی حفاظت نہ کر سکے..... لعنت پہنچتی ہوں میں تم پر اور تمہارے ساتھ شملک اس رشتہ از دو ان پر جو آج احساس دلار ہا ہے کہ میں کس قدر گرے ہوئے سچ شخص کے ساتھ دو کمرے سے زندگی گزار رہی ہوں۔“

اظہر کے دس لے نکلتے ہیں اس نے تیزی سے جا کر دروازے کی کنڈی پر حادی اور بید پر ادا نہ سے منہ کر رہی..... اگلے اس کی آنکھوں سے وہاں تھے اور دل میں برد کی پچاس بری طرح پیچہ رہی تھی اور داغ میں سوچوں کی بیلاغا جاری تھی..... وہ سب کچھ جو اس نے خود کو کتنی سے روک کر اس کے سامنے نہیں کیا تھا اب اس کی فہم سے کہہ لیے میں اس کے اندر سے بہرہ رہا تھا۔

کافی دیر رونے کے بعد وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔
 چند لمحوں تک تو وہ گویا بالکل خالی الدماغ ہو گئی
 تھی..... بڑی الجھی اور سر دنگ ہوں سے کر کے ہر شے
 کو بھینکے گی..... یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے کوشش
 کر رہا ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہو چکا ہے.....؟ اور اب
 اسے کیا کرنا چاہیے اپنے ساتھ بہت کچھ ہونے سے بچنے
 کے لیے۔
 ہمت کر دفرخ! ابھی وقت تمہاری مٹھی میں ہے

”اور میں امی کے پاس لیپے جاؤں وہ خود بہت مشکل سے زندگی کی گھڑی ٹھیک رہی ہیں اور پھر شازدہ کا مستقبل مطلقاً بہن اس کے راستے کا ردو ابن جانے کی بجھے یہاں سے تو لکھتا ہے ہر صورت ہر قیمت پر..... کہاں جاؤں؟“ وہ بے تکان سوئے گی اور تیزی سے اٹھ کر کمرے کی کلکٹر کی کوزرہ اس کھول کر کھڑے میں کسی موجودگی کا اندازہ لگا لیا۔

ہاگل سناٹا لگ رہا تھا۔ اچھی خاصی اچھی..... اچھی.....
 دیر کو کسی وقت واپس آئی چلا گیا تھا جیسے منظر پر تھکا
 آج کل ہیر جیڑ تھا اس لیے سارا سارا دن نوکری کی
 تلاش میں یا پھر دو دستوں کے ساتھ ہر قسم میں وقت
 گزارا رات کو گھر آتا تھا..... اماں بلا ناغہ دیر کو سونے
 کی عادی تھیں۔ اس نے جلدی جلدی چند بیڑے شام
 میں ڈالے اور بجوری کھول کر ان کی طرف سے طے کب
 یورپ پر س میں ڈالے اور پار اوڑھ کر کمرے سے اکل
 کمرے کے دروازے کے درمیان پر بند میں دو ان کے
 کمرے کا دروازہ..... واپس بیٹھ کر گھر سے اکل
 آئی..... ہمیشہ کے لیے ہے۔

☆ ☆ ☆
زندگی میں جب کچھ "ادارہ نوکھا" ہوتا ہے تو اسے
اولاً قبول کرنا بہت دشوار ہوتا ہے مگر جب یہ سہولتی ملتی
نصیب میں رہے تو پھر ہر بہرہ خواہش گزشتہ انسان کو کبھی
دیتا ہے کہ شکلیں اتنی پرورش کر آسان ہو سکیں۔ سفر کی
خاموشی اور اظہار اور اس کی بات کے داویلے نے حالات
کو ایک نارنج دے دیا۔ ہنر سے زیادہ اظہار ہر لمحہ
انسان کو اپنی بردہ کو پوچھنے کا وجہ ہے زیادہ آسان
نہ..... اس کے لئے تو کوئی بات ہی نہیں مریا اور اس کی

یوں دو سال بعد فرح دوبارہ ماں کے ہر اکریٹھ
مئی۔ شازدہ انار کا تاجان دے کر گھر میں فارغ رہنے
کے بجائے بچوں کو نیوٹن پڑھایا کرتی تھی اور عادل
بارٹ نام جاپ کے ساتھ چلی پی پڑھائی تو کبھی لے کر چل
جاتھا۔ بھائی تروتو سربراچی ہدی ہدی مگر می کو آئندہ کی
فکروں نے وقت سے پہلے پڑھ کر دیا تھا۔ مستقبل جو
خائف و خوفزدہ کیوں رہے ہیں بھلا کیا انسان محض حال
کی زندگی نہیں رہ سکتا۔ مستقبل اس کے "کل" کا "بچہ" ہے۔ دونوں مل کر اس
کے حال کو کبھی جیتے جا رہا ذلے ہیں اور انسان بے خبر و
جان اس کی جگہ کے ان دو پاؤں کے سچ پہ چلا جاتا ہے
زندگی ایک دن یوں ہی تمام ہو جاتی ہے۔

”ای آپ مجھے بوجھ نہ بنیں میں مدت کے باقی
چند روز کر کوئی کام ڈھونڈ لوں گی۔ ریکویشن کیا
کوئی چھٹی موٹی جاب تو مل ہی جائے گی۔“
پیری کی ترقی فکری نہ رہی۔ مدت ٹھاکر کی سرے لے۔
”مے سوچوں میں کتنی مالا کے ہاتھ قائم کر کہا۔
”یوں ٹھکانا تو میرا اقتدار ہے بنی۔ میرے اختیار
باہر عمر میری طاقت سے زیادہ کیا کروں کسے نہ
ہوں تمہارے لیے۔ تمہارا کھربا بھوا تھا اطمینان

فرخ نے جلدی سے نظریں چرائیں (ای آہ کو

”فرخ مجھے شانزدہ کا بھی خیال نہ آیا۔ اب کون کرے گا اس سے شادی..... تیری تائی تو پہلے ہی برفرخ زینتی بیٹی ہوئی ہے ہم سے اس کے بھی تو نہیں ماننے کی وہ..... تیری خالہ کا نشانہ کے بھائی کو درے کے میرا خاندان ابھی تک مقبوت نہیں ہوا ہے ان کی نظر میں میں..... خالہ کو وہ میرے کیسے کا معاملہ تھا ان کے کیسے کے گرد وہ تو اپنے دل میں سلاخیں بھیجیں بدلے کی آگ اب درہملا اس کی آج نہ دئے گی ان پر جب وہ نفس کا درشتہ کر آئے گی..... وہ مشکل ہے کروہی گوارا ابھی کریں اور اب تو تیرا یہ معاملہ انہیں مضبوط ہانہ دے رہا ہوگا.....“ وہ ہنسی دل کرتی ہو رہی تھیں۔

”اکی جو میرے نصیب میں تھا مجھے ملا۔ میرے پاس
تھا نہ وہ۔“ شازدہ کا نصیب انشاء اللہ بہت شاندار
کا۔ اس نے سب کی اور کئی..... اپنی بیماری ہی سے وہ.....
پچھلے گیارہ سو سالوں کی اس لگ جائے گی اس کے لیے اور
بہت سوچ بچار کے بعد بہت دیکھ بھال کے بعد اس
شادی کر گئے۔“ فرخ نے ہاں کا حوصلہ برہم کیا اور
دل کے مستقبل کی بھیجی بہت اچھی تصویر کشی کر کے ان کا
بیان خوش آئند دونوں کے تصور کی طرف موڑا۔
اور وہ خدا کی ذات پر کامل و غیر متزلزل بھروسہ
نے والی اس کی کہنتوں، عقلوں، پائیدار پس منظر
پر چرچہ کر رہی ہے سکون و عبرت کا توفیق ملتا ہے۔

☆☆☆
وقت سے براہر ہو گئی نہیں مگر یہ جو وقت ہے ناں
وقت و کثرت دُخ بھی ہے اور مر بھی..... کبھی کبھی ہے کہ
..... فرحِ جاہ تلاش کرتے کرتے اپنی کا شکار
لگی ناں اوپر سے اسی بھی حد درجہ چڑنی ہوئے گی
اس کے ساتھ..... ہچکار اے آپ میں شرمندہ
کہ کرات تو فنی اعزاز میں اسو حکم ہو گا.....

حوصلہ دیتے دیتے خود کسم ہوتی تھی۔

”فرح باجی کیا بات ہے جی۔ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں آپ کی؟“ کام والی ماسی رحمت بی بی نے ہمدردی سے پوچھا۔

کافی سالوں سے وہ ان کے ہاں گھر کی صفائی اور برتنوں کی دھلائی وغیرہ کا کام کرتے آتی تھی۔ سو گھر والوں کے ساتھ اتنی تو انسیت تھی کہ وہ ان سے حال احوال کر لیتی تھی۔ وہ فرح کے حالات سے واقف تھی اور بہت تاسف سے اس کے لیے سوچتی تھی۔

”ہاں رحمت بی بی۔ سر میں بہت درد ہے آج۔ راتوں کو نیند نہ آئے تو یہ مرض اور بڑھ جاتا ہے ناں۔“ فرح نے اداس مسکراہٹ لیوں پر لاتے ہوئے کہا۔

”آہ جی۔“ رحمت بی بی نے سمجھداری سے سر ہلایا۔ ”وہ میرا درد ہے ناں! وہ بھی اس مرض میں پڑا ہوا ہے جی۔ جب گھر آوے سر پکڑے بھی تو تکی راتوں کو اٹھ کر سر پکڑے بیٹھا رہ دے۔“ وہ اپنا دکھرا لے کر بیٹھ گئی۔

”اچھا۔ پھر علاج دلا دیا اس کا؟“ فرح نے قدرے بیزاری سے پوچھا۔

”ہاں جی۔ وہ کرتا ناں آپ اپنا علاج کوئی کپسول لاتا ہے جی وہ۔ یہ کسی سی گولی ہوتی ہے وہ کھاتے ہی بولتا ہے۔ اوائے رحمت دیا جنت ہوگی ہے سب درد سب فکر سب غائب! اوئے میں تو ہلکا پھلکا ہو کر اڑنے لگا ہوں۔“ رحمت بی بی نے پوری دلچسپی سے قصہ سنایا۔ ویسا ہی انداز اور لہجہ کر کے۔

”اچھا۔ تو تمہارا شوہر نشہ کرتا ہے یوں کہو ناں۔“ فرح نے ناگوار سی کہا۔

”نہ باجی جی۔ ایسا کہو تو جڑھ دوڑتا ہے مجھ پر کہتا ہے یہ سر پر سوار فکروں پر بیانیوں کی دوا ہے۔ نشہ تو اسی ہے۔“ رحمت بی بی نے بھی خاصا برا منایا۔

”اچھا۔“ فرح نے بات مزید نہ بڑھاتے ہوئے اسے فرمایا اور وہ دوبارہ جھاڑو اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

☆☆☆

”شانزہ۔۔۔۔۔ تم نے ایڈمیشن فارم سب مل کر لیا؟“ انس نے چائے کا کپ پکڑتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ انس کے اطمینان پر وہ اچھل پڑا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ میں گریجویشن پرائیوٹ کروں گی ریگولر نہیں۔“ اس کا اطمینان ہنوز تھا۔

”مگر کیوں؟“ انس نے حیرت سے ٹپکی کی طرف دیکھا۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہے چچی۔۔۔۔۔ سنا آپ نے؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ بیٹا مجھ سے مشورہ کر لیا ہے اس نے۔“

براڈیوٹ پڑھائی کے ساتھ کوئی نوکری کرنا چاہ رہی ہے۔ فرح بھی اپنی سی کوششیں کر چکی اسے تو نوکری نہیں ملی۔

اسیہ یہ بھی قسمت آزمائی کر لے۔“ انہوں نے غصہ کی آہ بھر کر کہا اور اسے کھانا کھا کر جانے کی تاکید کر کے مگر یہ

بڑھنے کو اٹھ گئیں۔

”میں پہلے بی ایڈ کروں گی پھر جاب کروں گی۔“

”آج کل چھوٹے موٹے پرائیوٹ اسکول بھی یہ ڈیمانڈ کرتے ہیں۔“ انس نے انس کو مطمئن کرنے کے لیے بتایا۔

”اور شانزہ! اگر میں کہوں کہ تم یہ دونوں خیال پھرو دو تو؟“ انس نے چٹخوں کی خاموشی کے بعد غور سے اس کی صبح چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو کیا۔۔۔؟“ شانزہ نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔ آج پہلی بار وہ براہ راست انس سے یوں کوئی دوسری بات کر رہی تھی۔

”تو یہ کہ۔۔۔۔۔ تم چچی کی فکروں کو کچھ کم کر دے۔“

بڑھانے کے میں چند دنوں تک اسی کو لے آؤں گا۔۔۔۔۔ چچی سے بات کرنے کے لیے۔“ انس نے اپنے لہجے کو بہت ہی نرم و شیریں بناتے ہوئے کہا۔

”کیونکہ بقول اپنی بہن کے بھیا آپ کسی بات پر شاباشی بھی یوں تو بخ کر دیتے ہیں گویا چھتر مار رہے ہوں۔ ذرا جو نرمی و شیرینی ہو آپ کے لہجے میں۔“

”لیکن اس بات کا میری پڑھائی سے کیا تعلق؟“ انس نے محض چند سانسوں کے لیے دل کی اتھل پھل ہوتی

انہوں پر دھیان دیا تھا۔

”نئے تعلق استوار کرنے کے لیے وقتی طور پر ہی سہی اسے تعلقات کو منقطع تو کرنا پڑتا ہے ناں۔۔۔۔۔ اس نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھا اور بڑی دلچسپی سے اس کے رنگ بدلتے گھبرائے گھبرائے سے روپ کو اکھوں کی مینا اور دل میں قید کر لیا۔

”یہ کیا بات ہوئی بھلا؟“ اس نے اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کی کوشش کی اس کی طرف

بہن بیٹھا گئی۔ وہ اپنی نگاہوں میں جہان شوق و وارفتگی کے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں

ہر ٹپکی اس کے جذبولوں کو عیاں کر رہی تھی اور لیوں پر ملتی دھیمی مسکان دل کی گن کا پتا دے رہی تھی۔

”وہ میری نماز کو دم پر ہو رہی ہے۔“ انس کو متنی خیر مسکراہٹ کے ساتھ کچھ بولا دیکھ کر وہ ہلکا کر کھڑی ہو گئی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ واقعی۔۔۔۔۔ وہ بھی چونک کر سیدھا ہوا۔“ میرا وضو نہیں ہے میں پہلے وضو کروں۔“ شانزہ اندر

ہالماز لینے کی اور وہ اس بین کی طرف بڑھ گیا۔

”چچی! یہ فرح نظر نہیں آ رہی؟“ کھانا شروع کرنے سے پہلے انس نے کافی دیر سے آتے خیال کے

بعد پوچھا۔ عادل بھی نو بجے تک آچکا تھا اور اس کے آتے ہی شانزہ نے دسترخوان بچھا کر کھانا چن دیا تھا۔ ویسے

اننگ نیکل تو موجود تھی مگر شانزہ جانتی تھی کہ انس کو بچنے دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا پسند ہے۔

”ہاں بیٹا وہ تو بس ایسی ہو گئی ہے۔“ گوشہ نشین لاکھ بستی ہوں لوگوں میں اٹھو بیٹھو بسو بولو۔ مگر اس پر

”عاطق اثر نہیں۔ ہر وقت سرور پکڑے بیٹھی رہتی ہے۔“

اب بھی شانہ سو رہی ہے دوا کھا کے۔“ انہوں نے آہ بھر کر نفسی جواب دیا۔ آزدگی اور بیٹی کے لیے فکر ان

کے ہر لفظ سے عیاں تھا۔

”یہ تو ٹھیک نہیں ہے۔۔۔۔۔ چچی آپ کہیں تو ان کے لیے کوشش کروں میں؟“ انس نے چپکے ہوئے کہا۔

”مگر وہ مانتے تب ناں!“ وہ پہلے سے زیادہ اداس ہو گئیں۔ ”چھپے دنوں آیا تھا ایک رشتہ دو بچوں کا باپ تھا

بہو گزر گئی تھی مگر فرح نے دوا دیا مچا دیا۔۔۔۔۔ مان کے نہیں دیا۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ آپ نے سمجھا یا تو ہوگا؟“ انس کو بھی افسوس ہوا۔

”کچھ کہ نہیں۔۔۔۔۔ ہر طرح سے منانے کی کوشش کی۔“

وہ یہی سے گویا ہوئیں۔

”چچی۔۔۔۔۔ آپ فکر نہ کریں۔۔۔۔۔ اللہ مالک ہے میں خود بھی بات کروں گا اس سے اور کوئی رشتہ نظر میں ہوا تو

کوشش بھی کروں گا۔“ انس نے ان کی دھارس بندھائی تو وہ ممنون نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

”کتنا مختلف ہے یہ اپنی ماں سے۔۔۔۔۔ ماں زخم لگاتی ہے تو بیٹا مریم رکھنے آ جاتا ہے کل ہی تو وہ چم کے

لگا کر نمک پاٹی کر کے گئی ہے اور آج یہ آ گیا ہے۔ خدا جانے اس کے دل میں بھی کیا ہے ناں کہاں مانے کی اور

اس میں اتنا دم ہوگا کہ وہ اسے مناسکے؟“ وہ کمر اسٹاس بھر کر سوچنے لگیں۔ ابلے چاول اور مونگ کی چکی دال

ساتھ میں کچے قے کے کباب تھے کھانے میں۔

”کیا سوچنے لگی ہیں چچی؟“ انس نے دسترخوان کا جائزہ لینے کے بعد ان کی طرف دیکھا۔

”بہنیں دعائیں دے رہی ہوں بیٹا۔۔۔۔۔ کتنا احساس و خیال کرتے ہو ہمارا۔۔۔۔۔ خدا ہمیں کامیاب و

کامران رکھے خوش رہو بیٹے رہو۔۔۔۔۔“ وہ شانزہ کو فرح کے کمرے میں دیکھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔

”آپ کی دعاؤں کی ہی تو ضرورت ہے مجھے چچی۔ اور پھر آپ کے کسی کام آؤں تو مجھے خوش

ہوگی۔“ انس نے احترام و عقیدت سے ان کی طرف دیکھا۔

”فرح آبی سو رہی ہیں ابھی۔“ شانزہ نے بیٹھے ہوئے بتایا۔

”جانے کیا ہو گیا ہے اسے“ صبح بھی دن چڑھ تک سوئی رہتی ہے اور اب بھی یہ کوئی وقت ہے سونے کا۔۔۔۔۔ کھانا بھی کم ہو گیا ہے۔“ وہ دل ہی دل میں کڑھ کر

سوچ کر رہ گئیں کہ اب دوبارہ اس کے ذکر سے ماحول دوبارہ اداس ہو جائے گا یہ جانتی تھیں وہ۔

شانزہ اور عادل اس کے ساتھ خوشگوار موڈ میں کھانا کھا رہے تھے۔ وہ بھی بخند ہی آہ بھر کر اپنی پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھانے لگیں۔

☆☆☆

”فرح آئی۔ یہ کیا کر لیا آپ نے اپنے ساتھ؟ کیوں کیا آپ نے یہ؟“ بتائیں جواب دیں؟ کہاں گئیں وہ ہمت و حوصلے سے چہنچہ کی باتیں۔ زندگی کا ڈٹ کر ہر وار سنبھلنے کی باتیں۔ یہ آپ ہیں آپ کا عزم و حوصلہ۔ کیوں ہو گئیں آپ اتنی بزدل اتنی کم ہمت؟“ شانزہ نے بے ساختہ اسے کندھوں سے پکڑ کر بھونچو ڈالا۔ اٹھک اس کی آنکھوں سے رداں تھے اور وہ بے یقینی میں ڈوبے جیلے اس کی زبان سے۔

ابھی ابھی ڈاکٹر ماریہ جو کچھ نہیں بتا کر گئی تھی وہ نہیں سکتے میں جیلا کر کیا تھا۔ امی تو اسی وقت لڑھک کر پاس پڑی کر رہی تھیں۔ جبکہ شانزہ شانے میں آئی بے یقین نگاہوں سے ماریہ کی شکل دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر ماریہ بھی ہنس جاتی تھیں اور دو گھر چھوڑ کر ان کا گھر تھا۔ شانزہ کے ساتھ اس کی اچھی خاصی علیک سلیک تھی وہ تقریباً فرح کی ہم عمر تھی۔ فرح کی روز بہ روز بگڑتی حالت اور گرتی ہوئی صحت سے گھبرا کر آج امی نے شانزہ کو بھیج کر ماریہ کو بلوایا تھا۔ اور اب وہ دونوں چچی بھتیجی حیران آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”شانزہ۔ شکر کرو فرح کی کنڈیشن ابھی آؤٹ آف کنٹرول نہیں ہوئی۔ ایک دو ماہ کے باقاعدہ علاج سے وہ بالکل ٹھیک ہو سکتی ہے ہم حوصلہ کرو اور اس اچانک چوہن کو پکسپٹ کرتے ہوئے فوراً کوئی بولڈ اسٹیپ اٹھاؤ۔“ ماریہ نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ فرح اسی طرح دناؤ دناؤ سے غبر سوری تھی۔ گویا اسے کوئی مطلب یا سرور کا نہیں تھا کہ وہ دونوں اس کے لیے کس درجہ فکر مند ہو گئی ہیں۔

”کیسا بولڈ اسٹیپ؟“ شانزہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر اور امی کی حیران آنکھیں مزید پھیل گئیں۔ ”فرح کو ہاسپتالز کرنا ہوگا۔ آج نہیں تو

گھونٹ رہا تھا۔ اذیت کا شدید احساس اس کا مطلق بند کر رہا تھا۔ امی چپ چاپ آنسوؤں کے مولی گرا رہی تھیں۔ اور فرح کی نشے میں بند ہوئی پلکیں شانزہ کا رونا چلاتا بھونچو ڈا دیکھ کر پٹ سے پوری طرح ابا ہو گئیں تھیں۔

وہ چند لمحوں کی تاخیر کے بعد بالآخر بھگتی کردہ لوگ جان بچے ہیں کہ ڈرگ ایڈکٹ ہو چکی ہے۔ زندگی کی مشکلات سے حالات کی بدصورتی سے بچنے کے لیے بزدلی کی اس راہ پر چل پڑی ہے جس کی منزل یا تو موت ہوگی یا ذلت بھری زندگی۔ مگر یوں کر اپنے لیے بے خبری۔ بے فکری اور لامعلیٰ ہنسنے کی ”دھند“ نے ہی تو ہم پرانے میں لیا ہوا ہوتا ہے۔ ہر فکر سے آزاد۔ ہر خبر سے بے پردہ۔ اور ہر آگے کے عذاب سے دور۔ وہ نظریں پچی کے نیچے رہی۔

”آئی۔ آپ کیا سمجھ رہی ہیں کہ اس لڑکی کی عادی ہو کر آپ ایک دن زندگی کے اس جال سے آزاد ہو جائیں گی اور موت کے بعد ہم لوگوں کے لیے آسمانیاں چھوڑ جائیں گی۔“ اب شانزہ اپنے اٹھک پونچھ کر نری سے اس کے پاس آن کر بیٹھی اور اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

”آئی، ہم سب آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ آپ کی وجہ سے جو فکر مندی ہے وہ اس لیے تو نہیں کہ خدا نخواستہ ہم آپ سے بیزار ہو گئے ہیں۔ ہم تو آپ کی جموی خوشیوں سے بھرنا چاہتے ہیں آئی۔ آپ کو آباد و مطمئن دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ نے یہ حل نکالا اپنی مشکلوں کا جانتی ہیں کس دلدل میں دھنسی چلی گئی ہیں۔“ مگر نہیں خدا کا شکر ہے آپ بروقت فکری ہیں۔ آپ کی ٹرینٹ ہوگی اور آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔“ وہ لفظ لفظ اسے سمجھانے لگی اور اپنے اندر قطرہ بہت جمع کرنے لگی کہ ان حالات میں اس کا کیا کراد ہوگا یہ وہ ابھی طرح جانتی تھی۔

فرح کچھ دیر سر جھکائے اسے متنی رہی اور پھر بے جان جسم کو گویا ٹھیک کر بستر پر دراز کیا اور گردن کے لیے کردہ بارہ سے آنکھیں موند لیں۔ شانزہ نے گہرا سانس بھرا

اور بے اختیار اس کی نظریں امی کی طرف اڑ گئیں جن کا سر کسی کی پشت سے ان کے شانے پر آگرا تھا۔ منہ کھل کر کیا تھا اور سانس دھونکھنی کی طرح تیز بڑھل رہی تھی۔

شانزہ ایک جست میں ان تک پہنچی تھی۔ ”امی۔ امی کیا ہوا۔ کیا محسوس کر رہی ہیں آپ؟“ اس نے جلدی جلدی امی کی ہتھیلیاں سہلا سیں اور گالوں کو ہلکے ہلکے تھپتھپا کر ہوش میں لانے لگی۔ ذرا کی ذرا آنکھیں کھول کر انہوں نے اسے دیکھا اور اس کے ہاتھ تھام کر اٹھنے لگیں۔

”کہاں اٹھ رہی ہیں آپ؟“ وہ پوچھا کہ اٹھانے لگی۔ امی خود ہی دو چار قدم چل کر پلنگ پر گری گئیں۔ اس کا کنزور سہارا اس وقت بہت بڑی ڈھارس بنا ہوا تھا۔ انہیں بستر پر لٹا کر وہ فوراً ہر طرف دوڑی ڈاکٹر ماریہ کو دوبارہ بلا۔ نے کے لیے۔ ابا نے سدھ لیتی ہوئی تھیں البتہ ان کے چھوٹے سکرے تاک کے ہتھکنے ان کی زندگی کی نوید سے رہے تھے۔

☆☆☆

فرح کی اس حالت کے انکشاف سے پہلے ہی وہ اسکول میں جاب حاصل کر چکی تھی اور ڈوبتی اگرتی کیفیت سے پہلے ہی اس نے پرائیویٹ لے اے کا فارم جمع کر دیا تھا۔ جبکہ بی ایڈ ایم ایڈ کا پروگرام فی الحال پائی کر دیا تھا۔ وہ اپنے ان فیصلوں سے مطمئن تھی کہ دفاتر اور حالات کا بھی تقاضا تھا۔ فرح بھی جاب کی تلاش مایوس ہو کر چھوڑ چکی تھی اور دوسری مادی کا نام سننا ہی اسے گوارا نہ تھا۔ نفرت سی ہو گئی تھی کہ شادی کے نام سے۔

شانزہ چاہتے ہوئے بھی دل مہم جیلے اس دے کے نہ بھاسکی تھی جو اس نے اپنی باتوں اور پرشوق باتوں نگاہوں سے اس کے دل میں چلا دیا تھا اس کا نازک دل اور نئے نئے لپٹے جذبات اس سر میں جکڑے جا چکے تھے مگر وہ شرق کی بیٹی جانتی تھی اسے یہ ادراک تھا کہ اپنے من سے کچھ نہیں کہنا۔ سوچوں خیالوں نے چاہے کتنی ہی دنیا میں دریافت کر لو پابندی نہیں مگر محبت کی دنیا میں

یہ ایک سوال نیا یافت ہی رکھتا ہے۔۔۔۔۔ ان کہا۔۔۔۔۔ خاموش زبان میں۔۔۔۔۔

وہ دل کو سمجھا بھرا کر اپنی زندگی میں گمن تھی۔۔۔۔۔ اس ابھی بھی کبھی بھرا آیا کرتا تھا اور اس کے انداز و اطوار وہی تھے۔ اس کے ذہنی جھلے بولنے لب اور جذبات کو آشکار کرتی نگاہیں شانزدہ کوڈ سب کر دیا کرتی تھی۔۔۔۔۔ مگر وہ بغیر ظاہر کئے بظاہر نارمل ہی رہتی تھی۔ اسے آپسہ آہستہ اور بہت سی باتوں کے ادراک کے ساتھ یہ بھی آگئی ہوگی تھی کہ اپنے جذبات کی حرمت و حریت اسی میں ہے کہ انہیں وقت سے پہلے باندھ کر دل کے سیپ میں بند رکھنا چاہیے۔

وقت اپنی مخصوص چال کے ساتھ چل رہا تھا اور اب زندگی تازہ تازہ سمجھوتے کے بعد کچھ ہل گئی تھی کہ فرح کی اس حالت نے انہیں بڑے مشکل حالات سے دوچار کر دیا۔

شانزدہ کا سکتہ ٹوٹا اور حیرت بھری تودہ نئے سرے سے اپنی ہمت و حوصلے کو سیٹ کر ڈٹ کر کھڑی ہو گئی۔ اسی نے بھی چند دن بستر تنہا لے کے باوجود ممتا سے مجبور ہو کر دل کو مضبوط کیا اور وقت کے اس وار کو سنبھالنے کی سکت پیدا کرنے لگیں۔

مگر عادل۔۔۔۔۔! عادل بھر ہی تو کیا۔۔۔۔۔ وہ فرح کے ساتھ کسی رعایت کا روادار نہیں ہو رہا تھا۔ پہلے کے حالات کا ذمہ دار بھی وہ فرح کو بھرا تھا وہ چاہتا تھا کہ اس کی اظہار کے ساتھ صلح ہو جائے مگر تب بھی فرح نے اپنی سن مانی کی اور طلاق کا بد خدا داغ اپنے ماتھے پر لگا کر شانزدہ کے مستقبل کو بھی سناہی میں لپیٹ دیا تھا اس نے اور اب نشے میں گم ہو کر وہ بھر ہی ہے کہ اس نے موت کی راہ پر چل کر اچھا کیا ہے۔

”وہ اور کتنا ہمیں ذلیل کر دے گی امی۔۔۔۔۔ خاندان والوں کے آگے پہلے ہی آپ اور میں مراٹھا کر پٹنے لائن نہیں رہے۔ شانزدہ کے لیے جو لوگ خواہش مند تھے انہوں نے اپنے ارادے بدل لیے ہیں اور مجھے۔۔۔۔۔ مجھے کون اپنی لڑکی دے گا۔ ہمارے گھر کے ماحول کو خراب سمجھا جائے گا مجھے طے نہیں گے بے پروا

اور غیر ذمے دار بھائی کے۔۔۔۔۔ آخر فرح کیوں ہمارے مستقبل اور زندگیوں کا تباہ کرنے پر جس گئی ہے۔۔۔۔۔ امی میں اسے باپ کیل میں ایڈمٹ کروا کر اپنا اور اس کا تباہ کر دینے دوں گا۔۔۔۔۔ جو بھی علاج ہوتا ہے وہ یہیں گھر میں چھپ چھپاتے ہوتا رہے گا۔ خاندان میں باپ کے لئے سے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کسی کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے بھی نہیں۔ سنا آپ نے۔۔۔۔۔ عادل نے سنبھلے اور پھر لیے لفظ امی کی سماعتوں میں اتارے اور غصے سے تنقنا ہوا گھر سے نکل گیا۔

امی مارے بے بسی کے ہاتھوں میں چہرہ چھپا روئے نکلیں۔ عادل نے تو ان کی بکڑی طبیعت کی بھی پروا نہیں کی تھی اور ماں کا پچھلای دل اور تار تار کر گیا تھا۔ شانزدہ جو بڑے نکل کے ساتھ بھائی کی باتیں سن رہی تھی اس کے جاتے ہی امی کے پاس آ گئی۔

”امی! پلیز، آپ اپنی صحت کو دیکھیں۔ باقی سب معاملے کچھ دنوں کے لیے ذہن سے نکال دیں۔ انشاء اللہ کوئی بہتری کی صورت حال بن جائے گی۔“ وہ ان کے چہرے کو دودھنے کے پلو سے صاف کرنے لگی۔

”مگر فرح کا کیا ہوگا؟“ انہیں پھر بڑے کو تھار تھیں۔

”یہ تو طے ہے امی کہ میں آپنی کو یوں سسک سسک کر مرنے نہیں دوں گی۔ اگر یہی حال عادل بھائی کا ہوتا تو کیا ہم انہیں یوں ہی چھوڑ دیتے؟ ہمیں ناں! تو پھر ہم فرح آپنی کو بھی ان کی غلطی کی اتنی کڑی سزا نہیں دیں گے امی۔“ شانزدہ نے دل کڑا کر بڑی دقتوں سے ”بھائی“ کے لیے ایسا کہا تھا۔ امی کا دل دہل ہی تو گیا تھا۔۔۔۔۔ وہ جھٹ سنے پر ہاتھ رکھ کر پچھنی آنکھوں سے دیکھنے لگیں۔ وہ ان کی دلی کیفیت سمجھ رہی تھی مگر وہ اپنے دل کا بھی کیا کرتی جو آپنی کی یہ حالت دیکھ دیکھ کر سارا دل کڑھتا رہتا تھا ساری رات جگا رہتا تھا۔

”پلیز امی، آپ خود کو سنبھالیں۔۔۔۔۔ عادل بھائی کا یہ مصدقہ ہے۔۔۔۔۔ آپنی بھی انسان ہیں ان کی سوچوں نے کتنی دھارے پر بہہ کر جو تاجہ کن سمت! اپنے لیے جتنی ہے وہ یقیناً ایک دن اس پر بٹھیاں ہوں گی۔“ شانزدہ دل ہی

دل میں نکل کے لیے پلاننگ کرتے ہوئے ہوئی۔

کل اسکول سے باپ لیے کر وہ ڈاکٹر ماریہ کے ساتھ دارالنجات جانے کا تہیہ کر چکی تھی۔۔۔۔۔ کہیں زیادہ اور ناقابل نقصان کا باعث نہ بن جائے۔ ایک بکلی خوف اب دامن گیر تھا۔

☆☆☆☆

”امی۔۔۔۔۔ سنا آپ نے ڈاکٹر کیا کہہ رہے تھے۔“ شانزدہ نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے تھابت زدہ ماں کا ہٹا پڑنا زرد چہرہ دیکھا۔

”جی! آئی جی۔۔۔۔۔ آپ کی بھی بات کی ٹینشن مت لیا کریں۔ اللہ بہتری کرے گا۔۔۔۔۔ حالات بدلنے دیے ہیں کتنی قسمت اگر آج موافق نہیں تو انشاء اللہ کل دور نہیں جب سب کچھ بہتری کی طرف مڑ جائے گا۔“ سمیرا نے بھی ان کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ کر حوصلہ دیا۔

”جیتی رہو بھئی۔ خدا نیک نصیب کرے۔ تمہارا ساتھ تو شانزدہ کے لیے بڑا بھگوان ہے۔“ امی نے اس کے ہاتھوں کو نرمی سے دبا کر تشکر سے کہا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے اس کے بھائی کو دیکھا ”ناصر بیٹا۔۔۔۔۔ آج میں تمہارا انکار بالکل نہیں سنتوں گی۔ کرایہ لینا ہے تم نے۔“ پچھلی مرتبہ بھی دارالنجات آنے جانے کا اس نے کرایہ نہیں لیا تھا۔۔۔۔۔ یہی آج انہوں نے پہلے ہی کہہ دیا۔

”کیسی باتیں کرتی ہیں آئی آپ۔۔۔۔۔ ابھی مجھے بیٹی اور بھائی کو بیٹا کہا اور ابھی غیریت جتا رہی ہیں۔“ ناصر سے پہلے ہی سمیرا نے منہ پھلایا۔

”سمیرا! ٹھیک کہہ رہی ہے آئی۔۔۔۔۔ میں بھی آپ کے عادل کی طرح ہی ہوں اور بھلا عادل ہوتا میری جگہ تو کیا وہ آپ سے کرایہ لینا؟“ ناصر نے بھی شائستگی کے ساتھ اپنا غلوں پیش کیا۔ عادل کے ذکر پر امی کے دل سے ہوک سی امی اور وہ بیک ایک آبدیدہ ہوئیں۔

”جائے کہاں ہوگا وہ۔۔۔۔۔ پچھتا پچھتا کر جانا تو دل کی یہ بے قراری کچھ کم ہوئی وہ تو روٹھ کر ایسا کیا ہے کہ پلٹ کر خراب نہیں لی۔۔۔۔۔ ایک بہن کی خاطر دوسری بہن اور ماں کو بھی زندہ درگور کر گیا ہے۔ خدا تجھے اپنی امان

میں رکھے عادل۔۔۔۔۔ تو جہاں کہیں بھی ہو خدا تجھے گرم و سرد سے بچائے رکھے۔ آمین!“

”اے ہاں یاد آیا آئی۔۔۔۔۔ مجھے عادل کے بارے میں پتا چلا ہے کہ وہ کہاں رہ رہا ہے آج کل۔“ وہ ناصر کی پر جوش آواز پر چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔

”کچ کہہ رہے ہو بیٹا؟“ ممتا کی تڑپ دو چند ہوئی ”کیسا ہے وہ کہاں رہتا ہے۔۔۔۔۔ مجھے ابھی کے چلو اس کے پاس میں اسے سنا کر گھر لے آؤں گی۔“ ان کی بے قراری سوا گئی۔

”ابھی۔۔۔۔۔“ ناصر کچھ گڑبڑا سا گیا ”ابھی تو وہ ادھر نہیں ملے گا میں کل خود جا کر سیدھے پکا یقین کر آؤں گا پھر آکر آپ کو لے جاؤں گا۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے آئی۔“ اس نے تو یوں ہی بر سبیل تذکرہ ان کا دھیان بنانے کو کہا تھا۔ یہ بھی سچ تھا کہ ایک دوسرے جان کے کہنے کے بعد وہ اپنی طرف سے اس کا پتا کر دیا تھا۔ مگر ابھی تک کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔۔۔۔۔ کل ایک دوست نے اپنا خیال ظاہر کیا تھا کہ اس نے اس لیے اور نقش قد کاٹھ کا لڑکا اپنے محلے کے ایک گھر میں آتے جاتے دیکھا تو ہے؟ مزید اس کے بارے میں معلومات لینے کو کہا تھا اس کو۔

”وہ۔۔۔۔۔ ٹھیک تو ہے ناں بیٹا؟“ امی کا جوش یک دم ہی جھاک کی طرح بجھ گیا۔

”جی، جی وہ بالکل خبریت سے ہے۔“ ناصر بھائی نے تلی دے کر دو بارہ اپنے دل کی بات دہرائی۔

”خدا تجھے اجر دے گا بیٹا۔۔۔۔۔ یہ بہت بڑی نیکی ہوگی تیری اور مجھ ممتا کی ماری پر بھاری احسان۔“ وہ آنکھوں میں آنی نمی کو دودھنے کے پلو میں جذب کرنے لگیں۔

شانزدہ جو بالکل چپ چاپ بیٹھی ماں کے تاثرات کو ٹوٹ کر رہی تھی یک دم ہی ان کے کندھوں پر بازو پھیلا کر خود سے لگا لیا۔ ان کے تڑپے پچھلے لفظ اس کا سینہ بھی چاک کر رہے تھے۔ ”یا اللہ کیا بنایا ہے تم نے ماں کا دل مجھی۔ کتنا تڑپ رہی ہیں وہ اپنے بیٹے کی ایک جھک دیکھنے کے لیے۔ بیٹا بھی وہ جو اس کا واحد سہارا ہے اس کی تنہائی کا بانٹنے والا بھی اور اسے دنیا میں تحفظ کا احساس

دلانے والا بھی۔ شانزہ نے بڑی مشکل سے اپنی آنکھوں کو برسنے سے روکا مگر پھر بھی اس کی سطر کو گھبراہٹ ہوئی۔ یہی ٹیکسی ان کے دروازے کے پاس آ کر رکی اور وہ دونوں کا شکر یہ ادا کرتی اتر گئیں۔

☆☆☆

”آئی..... کیا سوچ رہی آپ اتنی دیر سے؟“ شانزہ نے گھڑکی کے پاس گھڑی فرخ کے کندھے پر زری سے ہاتھ رکھا۔

”ہوں.....؟“ وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اندازاً سوالیہ تھا۔

”میں پوچھ رہی ہوں اکیلے اکیلے کیا سوچ رہی ہیں کچھ مجھے بھی تو بتائیں نا!“ اس نے اپنی بات دہرانے کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر کرسی پر بٹھایا۔

فرخ دوبارہ کے علاج کے بعد مکمل صحت یاب ہو کر گھر آ چکی تھی۔ وہ اب بالکل صحت مند اور نارمل تھی۔ مگر اسے گویا چپ کی لگتی تھی..... ہر وقت کم صبر رہتی جانے کیا سوچتی رہتی تھی..... البتہ اپنے کئے پر پشیمانی کے آنسوؤں کو وہ ان دونوں کے گلے سے لگ کر بے دریغ بہا چکی تھی..... اب بھی جب بھی ان کی سوچوں پر اس کی شرمندگیوں کی گرد سے اٹ جاتی تھی..... اور آنکھوں کے پائے چھلکا چھٹکتی تھی۔ تب شانزہ بے ساختہ اسے سینے سے لگا کر اپنا بیت و خلوص کا بے پایاں احساس اس کے اندر منتقل کیا کرتی تھی..... اب بھی وہ گھڑکی کے پاس گھڑکی باہر گلی میں کرکٹ کھیلتے بچوں کو کافی دیر سے دیکھ رہی تھی اور جانے کیا سوچے جا رہی تھی کہ تھوڑی دیر پہلے کی بٹاشیت غائب ہو گئی تھی اور پھر سے ادا سی کی زردی کھٹکتی تھی۔

تھوڑی دیر پہلے ہی تو ماریہ کی بھابی اور اس کی تین سالہ گول منول سی بیٹی ردا آئی ہوئی تھیں..... فرخ کی خیریت پر مجھے فرخ سارا وقت ردا کے ساتھ چھوٹی چھوٹی باتیں کر کے انا بدل بھلائی رہی تھی اور ردا کی تو قلمی زبان میں ادا ہوئے ادھر سے جملوں اور ٹوٹے پھوٹے لفظوں

کو دلچسپی سے سن رہی تھی..... اس کا چہرہ زندگی کی روشنی پا کر ہشاش بشاش گھٹنے لگتا تھا اور ہونٹوں پر آئی مسکراہٹ اس کا چہرہ روشن کر گئی تھی۔ شانزہ اور اسی دونوں کے ایک وقت دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور محبت بھری نظروں سے اسے دیکھا اور ان کے جاتے ہی وہ گھڑکی کے پاس آ کر بیٹھی۔

”آئی..... اپنے دل میں آئی باتیں شیئر کیا کریں مجھ سے جو بھی بات ہو..... انٹی سیدھی اوٹ پٹا لگا۔ غصہ دلانے والی پاڑا دینے والی سب کچھ منہ سے بول دیا کریں..... دل و دماغ میں جمع کر کے مت رکھیں..... وہاں رہ رہ کر ان کا زہر آپ کی رگ و پے میں اتر جائے گا اور آپ کو مایوسی کے اندھیروں میں پناہ لینے پر مجبور کر دے گا۔“ مجھ رہی ہیں ناں! میں کیا کہہ رہی ہوں؟“ شانزہ نے نہایت نرمی سے اس کے ہاتھ کو اپنے

پانچوں میں لے کر دیا۔

”ہاں مجھ رہی ہوں.....“ کافی دیر بعد اس نے آہستگی سے کہہ کر اپنے ہاتھ کو کھینچا اور پھر بے بال مسہل کر پیچھے کئے۔

”تو پھر.....“ وہ ان کی طرف بھور دیکھ رہی تھی۔

”میں ٹھیک ہوں شانزہ..... اور تم بے فکر رہو میں دوبارہ اس گڑھے میں نہیں گر دوں گی جس سے بچنے کر کم نے بڑی مشکلوں سے نکالا ہے مجھے۔“ وہ ہنسی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”میں جان گئی ہوں گڑیا..... زندگی جتنی لگ دی ہے رب نے اتنی تو گزاری ہی پڑے گی..... رہی خوشیوں کی بات تو وہ اپنے اپنے نصیب سے ملتی ہیں..... یہ جانتی ہوں میں۔“ وہ بے ساختہ اپنی ہتھیلیاں پھیلا کر بخور دیکھنے لگی۔ گھڑکیوں کا نہ سمجھ میں آنے والا حال تھا۔

”شاید خوشیاں ان ہی چندوں میں کہیں اچھے کرسمس ہو گئی ہیں۔“ اسے خیال آیا تو اس نے بول دیا۔ وہ غصہ دیکھ کر رہ گئی کتنی بھی کیا بھلا شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ زندگی کا سارا کھیل..... قسمت کے تالوں پاؤں کا ہی ٹو ہے۔

”گڑیا..... دیکھ صرف اس بات کا ہے کہ میرا نصیب

کونسا ہے؟“ وہ گھڑکیوں کا کیوں بگڑا؟ تم دونوں کے خواب ارادے سب پکنا چور ہوئے تو میری وجہ سے اس کا گارا بند گھٹنے لگا تھا۔

”آئی.....“ شانزہ نے غصے سے دیکھا۔ ”پھر وہی طبول باتیں جو جتنی زیادہ مرتبہ دہرائیں گی اتنی زیادہ سنگین گھٹنے لگیں گی..... اس سے لاکھ درجہ بہتر نہیں کہ ان کا ذکر ہی نہ کیا جائے..... دل و دماغ میں خیال آئے ہی تو اسے ارادی کوشش سے جھٹک کر کچھ اچھا اور ٹھیکوار سوچا جائے آپ ایسا کر کے تو دیکھیں گی۔“ وہ پھر سے تاحیاتی سمجھانے لگی تھی۔

”آئی حضرت علمی کا قول ہے کہ خدا اپنے بندے کو اس کے گمان سے بڑھ کر دیتا ہے۔ وہ جیسا گمان کرتا ہے اسے دیا یقین ملتا ہے۔“ آپ اچھا اچھا سوچیں انشاء اللہ دیا ہی اچھا اچھا ہوگا۔“

اس کے لہجے کا یقین فرخ کے دل میں بھی ترازو اور تھا..... اس نے بے ساختہ ہی چھوٹی مگر حوصلوں میں اپنے سے بڑی بہن کو گلے سے لگا لیا اور آکھیں بند کرتے ہی دو قطرے اس کے رخساروں پر لڑھک آئے۔

انہیں اسی نے قریب آ کر اپنی پوروں میں سمیٹ لیا اور اس کا سراپے سینے سے لگا لیا۔

☆☆☆

”شانزہ.....“ وہ جیسے ہی اسکول گیٹ سے باہر نکلی اس بائیک کے پاس گھڑا اس کا منتظر تھا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ اسکول میں نوٹن پر اس سے بات کر چکا تھا۔ بڑی مشکل و بچ میں جلتا ہوتے ہوئے اس نے اس کے ساتھ ہانے کی ہائی بھری تھی۔

رائل بیلیو پلین سوٹ پر بڑا سارا پرنٹڈ دوپٹا سلپتے سے سر پر اوڑھے وہ اس کے سامنے تھی..... دھوپ کی لہازت کا مقابلہ کرتا اس کا گورا رنگ کچھ کچھ سنوٹلا سا کیا تھا مگر پھر بھی چہرے کی جاذبیت اور کشش وہی آہ و اب والی تھی..... ہونٹوں پر پتھر لپ اسٹیک اور فائنل بڑے کلائی پر بلیک اسٹیپ والی رسٹ داچ تھی۔ اپنی لام تر سادگی اور دلکشی کے ساتھ وہ اس کے فیصلے پر

”اٹل“ کی مہر لگا رہی تھی اور اس کے دل میں بندے ارادے کو مزید مستحکم کر رہی تھی۔ ”چلیں.....“ اس کے قریب آتے ہی اس نے بائیک اسٹارٹ کر دی۔ وہ چپ چاپ منہ جھک کر بیٹھ گئی..... دونوں بالکل خاموش تھے۔ اور یہی خاموشی بول بھی رہی تھی۔ ”اس کی زبان بھی تو جب زبان شاہد بھی مجھ میں آئی ہے اور شاہی دہتی ہے جب زبان خاموش ہوتی ہے نا جب ہونٹ چپ ہوتے ہیں اور زبان ہی کو یا ہوتی ہے نا جب ہونٹ چپ ہوتے ہیں اور زبان گنگ..... تھوڑی دیر بعد ہی دونوں کسی پارک کی پہنچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔

”بتائیے اس بھائی..... آپ کو مجھ سے کیا بات کرنی ہے؟“ شانزہ نے دل کو جھک کر اپنا سر بدلتے کوکھا اور ہمت کر کے بات شروع کی۔

”شانزہ..... میں اکیلے ٹھک گیا ہوں۔ اب تمہارا ساتھ چاہیے۔ ایک سے دو بھلے کے مصداق شاید یہ راستہ آسانی کے کٹ جانے اور منزل پائیں ہم۔“ اس نے درمیانہ جھولیوں کی کباری پر نظر میں جمائے کہا۔

”کیا مطلب.....؟“ وہ واقعی الجھ گئی تھی ان کی بات سن کر۔

”شانزہ..... میں تمہیں پسند کرتا ہوں چاہتا ہوں تمہیں..... اپنا بھی اور اپنے دل کی طرح اپنے گھر میں بسانا بھی..... مگر اتنے سالوں سے امی کے ساتھ میری مرد جنگ چل رہی ہے۔ وہ مان ہی نہیں رہیں..... خواہ مخواہ انا کا مسئلہ بتالیا ہے انہوں نے..... ابو تو دل سے راضی ہیں بڑے بھائی بھی اور بہنیں بھی بظاہر تو امی کی ہم خیال بن رہی ہیں مگر دل سے وہ بھی راضی ہیں۔“ اس نے جھجھکتے ہوئے بتایا۔

شانزہ حیران نظروں سے دیکھنے لگی مگر سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے؟ چند لمبے نام ہی خاموشی طاری رہی۔

”شانزہ..... کیا تم ایسا نہیں چاہتیں؟“ اچانک ہی اس نے اس کی حیران آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا تو وہ گڑبڑا سی گئی..... فوراً نظریں چرائیں۔

”اٹل بھائی پلیز..... آپ مجھے اچھا نہیں مت“ آخر یہ سب مجھے بتانے کا مطلب کیا ہے آپ کا؟“ اس نے

دل کی تائید پر اپنے لفظوں سے لکیر کھینچی۔

”شانزہ..... میں چاہتا ہوں کہ ابھی ہم ابو اور چچی کی رضامندی سے شادی کر لیں! ابھی آخر تک ختم نہیں کی ایک ندیک دن ابھی مناجاتی ہیں گئے ہم دونوں مل کر۔“ بالآخر اس نے وہ کہہ دیا جو عثمان کر آیا تھا۔ اور اسے گمان تھا کہ شانزہ کو بھی منالے گا وہ..... اپنی محبت کا واسطہ دے کر اور اس کی محبت کا احساس دلا کر..... مگر یہ طے تھا کہ بات دل کی رضامندی سے ہوگی۔

”اس بھائی..... چند ساعتوں تک تو اس کی زبان گویا تالو سے چپک گئی وہ کم صبر کی ہو کر اپنے پاؤں کے نیچے پھٹی ہری گھاس پر نظریں جمائے بیٹھی رہی تھی..... ذہن میں لفظ ڈھونڈ کر جملے ترتیب دینے کے بعد اس نے اعتماد کے ساتھ سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

”اس بھائی..... میں چار سال پہلے دلی شانزہ نہیں رہی ہوں..... تجھے آپ تعلیم منقطع کرنے کا کہہ کر کمزور سی اس دلا کر گئے تھے۔ ان سالوں نے مجھے بہت مضبوط بنا دیا ہے..... دل کے فیصلے کرتے وقت عمل کو بھی پامان بنانا چاہیے۔ یہ نہیں سمجھ سکتی ہوں۔“ وہ کچھ بھر سو رہی اور اس کا امید و تم کے آتے جاتے رنگوں میں ڈوبا چہرہ دیکھا..... وہ دل تھا بے فیصلہ سننے کا خطر تھا۔

”فرح آپ کی زندگی کا تجربہ میرے سامنے ہے..... عادل بھائی ہمیں سچ سمجھدار میں چھوڑ کر جانے کس دیں جائے ہیں..... اتنے سالوں میں ایک مرتبہ بھی اپنی خیریت کی اطلاع نہیں دی۔ خدا انہیں اپنی امان میں رکھے۔ ہمارے دلوں میں یہ یقین پیوستہ ہے کہ وہ جہاں بھی ہیں ٹھیک ہیں..... بس ان کا وقتی غصہ ان کی انا کی کڑی بن کر پاؤں میں آ پڑا ہے جس دن یہ کڑی ٹوٹی وہ لوٹ آئیں گے۔“ وہ بات کا رخ بدل گئی تھی..... شاید جان بوجھ کر یا شاید بے ساختگی میں بلا ارادہ..... کہ بے سائبان ہونے کا احساس تو ہمہ وقت ہی ساتھ رہتا تھا۔ بھائی کے ہوتے ہوئے بھی عدم تحفظ تو تھا ناں!

”شانزہ..... پلیز مجھے میرے سوال کا جواب دو پہلے۔“ اس نے اچھے ہوئے کہا۔

”آپ کے سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔“ اس نے گہرا سانس بھر کر کہا۔ ”پلیز اب مجھ سے چھوڑ دیں..... دیر ہو رہی ہے آپ کی بھی کیپوٹر سیشن..... ہوں گی۔ کھانے پر میرا انتظار ہو رہا ہوگا۔“ کا کہہ کھڑی ہو گئی۔

”شانزہ تم بھی مجھے یوں ہی سچ سمجھدار میں چھوڑ جا رہی ہوں۔“ اس ہنوز پیشاب رہا۔

”آپ جس بھنور میں پھنسے ہیں اس سے نکلاں گی خود آپ کے اپنے ہاتھوں میں ہے..... آپ دل کی نادانی میں آ کر تجھے بھی اسی بھنور میں پھنسا رہا ہے.....؟“ اس نے سوالیہ پوچھا۔

”نہیں، میں تو تمہارے سہارے اس بھنور سے اٹھ چاہتا ہوں۔“ وہ اس کی بات پر ڈوبے کو سنبھالنے کے مصداق کچھ بڑبڑاتا ہوا۔

”آپ مرد ہو کر عورت کے کمر سہارے پر بھروسہ کر رہے ہیں؟“ اس کا انداز ہنوز تھا۔ ”سوری اس بھائی..... مجھے اپنے مستقبل سے بڑی خوش آئند توقعات ہیں میرے نزدیک شریک زندگی کا تصور آپ کے تصور سے بالکل مختلف ہے.....“ اس کا لہجہ خوش تھا۔

”مطلب؟“ وہ بھی نا امید ہوتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

”مطلب یہ کہ مجھے ایسی خیر رفاقتیں قبول نہیں۔ جس زمین میں عزت کا ج نہ دیا جاسکے وہ محبت و مان کا پھل کیسے دے سکتی ہے..... میرے نزدیک محبت سے بڑھ کر عزت ہے..... جو عزت وقت و کار میں جاتی ہوں وہ آپ بھی نہیں دے سکیں گے کیونکہ حاصل ہو جانے کے بعد جذبات کی شدت وہ نہیں رہتی اور دیر سے دیر سے سب منظر بدل جاتے ہیں..... اور میں اس رسک پر اپنی زندگی داؤ پر نہیں لگا سکتی۔“ اس نے صاف لفظوں میں اپنا مدعا کہا اور جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔ اس چند لمحے ساکت و صامت وہ کھڑا رہ گیا۔ بے جان نظروں اور بجھے دل کے ساتھ اسے مونہ سائیکل کے پاس سے گزر کر بس اسٹاپ کی طرف جانا دیکھ رہا۔

”اور یہ تو طے تھا شانزہ کہ میں تمہیں یا تمہارے دل

کو اور نہیں کروں گا..... نہ اپنی محبت کے لیے اور نہ اپنا ہاتھ دینے کے لیے مگر اب دل سے یہ کھٹک کھٹک دور ہو گئی کہ میری دھڑکن میں ہوتے ہوئے بھی میری نہ بن سکیں..... میری چاہت کا احساس رکھتے ہوئے بھی مجھ سے من موڑ نہیں..... دعا کروں گا شانزہ کہ اپنے دل میں اٹھاتے دیے کو اپنے ہاتھوں بچھا کر بھی خدا کرے تم بہت زیادہ خوشیاں پاؤ..... مان و محبت پاؤ..... اور وہ سب کچھ جو مستقبل سے تمہاری توقعات ہیں۔“ وہ ٹوٹے دل کے ساتھ وہیں کھڑا سوچتا رہا۔ ”اور شاید یہ طے تھا کہ مجھے وہ خوشیاں ملتی ہیں نہیں سمجھتا تھا۔ دینا آپ نے پسند نہیں کیا..... واقعی مان و شان کے بغیر ملی محبت لہرات ہی لگا کرتی ہے..... محبت تو اعزاز کے ساتھ دی اور لی جاتی ہے ناں بھی دل کی خوشی عمل ہوتی ہے۔“ اور وہ خود کو باور کراتا اپنے دل کو سمجھاتا دوبارہ اسی سچ پر بیٹھ چکا تھا۔

☆☆☆

”فرح..... آج شام کو کچھ لوگ شانزہ کو دیکھنے آرہے ہیں وہ آئے تو اسے بتا دیا اور تم بھی فراڈھنگ سے تیار ہو کر بیٹھنا۔ میں دوا لی کر سوری ہوں مجھے عصر کے وقت آواز دے دینا۔“ اسی نے کپڑے استری کر کے عام سے نقوش والی اپنی اس بیٹی کو دیکھا جو اذیت کی اس بھلی سے گزر کر آئی تھی جس نے اسے بچپن کے لیے کندہ بنا دیا تھا۔ وہ ہمت و حوصلہ کی ڈھونڈ سکتی کے چھوٹے چہرہ دوبارہ سے سنبھال کر زندگی و حالات کی لہروں سے تیراؤ رہی۔

فرح انہیں سارا پس منظر بتا چکی تھی۔ اسی میں ہاتھ نہیں ہوں..... وہ مجھ پر الزام لگایا تھا ان لوگوں نے..... اظہر غصے سے تھلا اٹھا تھا اگر میں اس کی اتنی بڑی بات سن کر بھی وہاں رہتی تو شاید میرا انجام خود کشی ہوتا میں خود کو آگ لگا بیٹی یا پھندا ڈال کر مار ڈالتی۔ مگر امی میں وہ ذلت بھری زندگی کیسے گزارنا گوارا کرتی..... مجھے آپ کا شانزہ، اور عادل کا سب کا خیال آیا تھا..... مگر میں کہاں جاتی یہاں نہ آتی تو؟ بتائیں امی..... میں اپنی عزت کا سودا کر سکتی تھی۔“

امی ردود کر کے اس کے انکشاف کو سن کر دھک سے رہ گئی تھیں اور اس دن ان کے دل سے اتنے سالوں بعد ذرا بھر باقی کھٹک بھی ختم ہو گئی تو گویا نیا سورج طلوع ہو گیا..... خوشی کی آس جھلکا اٹھی۔ انہوں نے اس کی شادی کی امید دوبارہ سے باندھ لی اب تو ان کی بیٹی ہاتھ پن کے الزام سے بری تھی۔

”مگر امی آپ زمانے کو کیسے یقین دلا پائیں گی اس بات کا؟“ فرح نے ان کی امید کو کچھ بھر میں بھی ڈگر دیا۔ ”جانتی ہیں اظہر نے طلاق کے کاغذات کے ساتھ مجھے دھکی آ کر خط لکھا تھا کہ اگر میں نے یہ راز کسی پر ظاہر کیا تو وہی میری زندگی اجیرن کر دے گا اور یہ کہ اب میں تمام عمر اس الزام کے ساتھ اپنی ماں کے گھر ہی بیٹھی رہوں دوسری شادی کا خیال تک نہ لاؤں دل میں..... ورنہ وہ میرے لیے مسئلہ کھڑا رہے گا۔“ وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹتی تھانے لگی۔

”بہنہ..... گلیڈ سمجھتا ہوں..... ہم اس کا راز افشا نہیں کریں گے مگر تم پر آیا الزام ضرور دھوئیں گے۔“ فرح اس بات کی فکر نہ کر دفرح اللہ بہتر کرے گا۔“ امی نے اپنے غصے پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔ وہ بھی اب ذرا اس کی بات کو دل پر لینا چھوڑ چکی تھیں۔ وقت اور حالات نے ہمت بنا دیا تھا اور کچھ یوں کہ مشکلیں اتنی پڑیں کہ آسان ہو گئیں کہ شل بھی صادق آ رہی تھی۔

”مہمان کتنے سچے آئیں گے؟“ فرح نے پوچھا تو وہ اپنے خیالوں سے چونکیں۔

”عصر کے بعد کھلوا ہے خالہ جی نے۔“ وہ اسے مختصر ایتنا کر چلی گئیں۔

”خدا کرے وہ لوگ بہت اچھے ہوں۔“ شانزہ کی قدر کرنے والے اسے محبت و مان دینے والے۔“ فرح نے دل سے دعا کی اور دل ہی دل میں شام کو کی جانے والی تیاری پلان کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ہی شانزہ بھی آ گئی۔ آج خلاف معمول وہ کچھ لیٹ بھی آئی تھی اور اس کا چہرہ بھی اترا سا لگ رہا تھا۔

”کیا بات ہے گڑیا..... آج بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو، لگتا ہے آج ایکسٹرا بھر لیٹ بٹھکے پڑے ہیں تم

کو۔“ فرح خوشگوار موڈ میں پوچھ رہی تھی..... شانزہ نے دل میں بڑی خوشی محسوس کی اور اس پر طاری تھکن جیسے منٹوں میں غائب ہو گئی۔

”ہاں آپ!..... آج یوں لگ رہا ہے جیسے اسکول سے گھر تک پیدل چل کر آئی ہوں۔ جوڑ جوڑ میں دھکن بسی ہوئی لگ رہی ہے اور سب سے زیادہ آبلے دل پر بڑے ہیں۔“ آخری جملہ آہستگی سے کہا جو صرف خود سن سکی۔ کام میں مگن فرح نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور ہاتھ میں پکڑے آخری کٹن پر کور چڑھا کر صوفے کے کنارے پر رکھا اور اس کے قریب چلی آئی۔

”محنت بھی تو کتنی کرتی ہو تم، دیکھو ذرا کتنا سنولا گیا ہے تمہارا رنگ و روپ دھوپ تو دشمن ہوتی ہے گوری رنگت کی..... اور پھر تم تو خود سے ہو بھی بے پروا نہ کوئی کیئر کرتی ہو نہ کوئی لوشن کریم لگاتی ہو۔“ فرح فکر مندی سے بولی۔

”خیریت آپ!..... یہ آج میرے رنگ و روپ پر اتنی ریسرچ کیوں ہو رہی ہے بھلا؟ لگتا ہے کوئی مہمان وہاں آنے والے ہیں..... ہیں نا!“ شانزہ نے یوں ہی نکامارا جو کہ ٹھیک نشانے پر بیٹھا تو جانے کیوں وہ ایک دم سے چپ ہو گئی..... (کیا مجھے آپ! سے شیر کرنا چاہیے؟) وہ سوچنے لگی۔ فرح چند لمحے اس کے یک دم تاریک پڑتے چہرے کو دیکھتی رہی اور کچھ سوچ کر چونک اٹھی۔

”گڑیا..... کہیں تم اس کا انتظار تو نہیں کر رہی؟“

”آپ سے کس نے کہا؟“ شانزہ مبہم سا چونکی مگر ظاہر نہیں ہونے دیا۔

”کون کہے گا؟ یوں ہی خیال سا آ گیا..... اس بار ہا امی کے کانوں میں یہ بات ڈالتا رہا ہے..... مگر شانزہ تائی امی بہت دکھری مزاج کی خاتون ہیں..... اول تو وہ اس کی بات مانیں گی نہیں اور بالفرض اگر مان بھی گئیں تو ان کا دل کبھی تمہاری طرف سے صاف نہیں ہوگا۔ وہ تمہیں کبھی دل سے قبول نہیں کریں گی۔“ فرح نے اپنی طرف سے خیال آرائی کی۔

”آپ کو کیسے اندازہ ہوا اس بات کا؟“ وہ بہن سے اپنے دل کا یہ بوجھ شیر کرنا چاہتی تھی جیسا بات

بڑھاتے ہوئے بولی۔

”تائی اماں کی باتوں سے..... بتایا ابا کے اشاروں سے دراصل شانزہ تائی ابا امی سے یہ بات کر کے گئے ہیں کہ تائی امی کی رضا مندی کے بغیر تم دونوں کی شادی کر دی جائے اور ہمارے اکیلے پن کی وجہ سے اس بھی فی الحال یہاں رہنے لگے۔ بعد میں تائی کو ماننا ہی پڑے گا اور وہ اس کو آکر لے جائیں گے۔“ اس نے کچھ بھی نہ چھپاتے ہوئے سب کچھ بتا دیا۔

”اور امی نے کیا کہا انہیں۔“ اس نے گہرا سانس بھر کر اپنے تنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑا۔

”امی بیچاری کچھ کہہ ہی نہیں پائیں..... اور وہ سوچنے کا کہہ کر چلے گئے..... بعد میں امی خوب روئیں..... عادل کے بے حسی کو مورد الزام ٹھہرا لے لگیں..... اس کو یاد کر کے روتی رہیں۔“

”آپ!..... آج اسکول سے واپسی پر اس بھائی ہم سے ملنے اسکول آئے تھے۔“ اس نے چند لمحے کی خاموشی کے بعد چند جملے ذہن میں ترتیب دیے اور ساری بات انہیں بتائی چلی گئی۔

فرح پوری توجہ سے سنتی رہی اور بات کے آخر میں گہرا سانس بھر کر اس کی طرف دیکھا ”تم نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا گڑیا..... عزت و مان بڑھاتی رفاقت سے ایک دن محبت کے سوتے پھوٹ پڑتے ہیں مگر کیکر بو کر گلاب اگنے کی تمنا کرنا عبث ہے۔“

”اب میں خود کو بالکل آزاد اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہی ہوں آپ!۔ آپ سے شیر کر کے..... ورنہ سارا راستہ یہی سوچتی آئی تھی کہ جلد بازی میں اپنا بھرم تو بھا کر آئی ہوں کہیں دل توڑنے کا گناہ تو سر زد نہیں ہو گیا۔“

”نہیں، تم نے تو کئی دل ٹوٹنے سے بچائے ہیں۔“ گڑیا اور دیکھنا خدا تمہیں اس کا بہت اچھا سا انعام ضرور دیں گے۔“ فرح نے محبت پاش نظروں سے اپنی بہادر اور محسوس بہن کو دیکھا..... جو اپنی قدر اور عزت نفس کو ہمارے کردل میں پھونٹنے والی محبت کی نوخیز کلی کو نوچ کر دیا پھینک آئی ہے۔

دونوں کو چونکا دیا..... بیل کا بٹن آف تھا اس لیے آنے والا اگلیوں کی مدد سے گیٹ ناک کر رہا تھا۔
 ”اس وقت کون آگیا؟“ فرح نے بے ساختہ وال کلاک کی طرف دیکھا۔ پہرے کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔

”یہ تو گیٹ کھول کر ہی پتا چلے گا ناں آپ؟“ شانزہ نے خالی کپ ٹیبل پر کھاد رکھری ہو گئی۔
 ”دھیان سے شانزہ اچھی طرح پوچھ کر کھولنا۔“ فرح نے بھی اس کے پیچھے قدم بڑھا دیئے۔

”کون.....؟“ شانزہ نے قریب ہو کر پوچھا۔
 ”عادل..... دروازہ کھولو شانو.....“ خاصی بلند آواز تھی دونوں نے بے یقینی کی کیفیت میں ایک دوسرے کو دیکھا۔

”دروازہ کھولو..... میں آگیا ہوں شانو۔“ ادھر سے دوبارہ اصرار ہوا تو شانزہ نے میکائی انداز میں ہاتھ بڑھا کر چٹنی گرا دی۔ عادل..... ان کا روٹھا ہوا بھائی..... امی کا بچپن کا بیٹا پہلے کے مقابلے میں بھرپور

”آئی آج تو آپ نے باتوں سے پیٹ بھر دیا میرا..... کیا کھانے کو کچھ نہیں بچایا میرے لیے۔“ دل و دماغ سے بوجھ سہکا تو پیٹ نے پھوک کی دوہائی مچا دی۔
 ”دیکھا..... کیسی مت ماری گئی ہے میری..... بہت باتونی بنا دیا ہے تو نے مجھے جاؤ تم ہاتھ منہ دھو کر آؤ میں کھانا نکالتی ہوں۔“ فرح نے جلدی سے کچن کا رخ کیا۔

”امی سو رہی ہیں؟“ شانزہ نے منہ پر پانی کے چھپا کے مارتے ہوئے پوچھا۔
 ”ہاں انہوں نے ٹیبلٹس لی تھیں نا!“ اور پھر وہ اسے شام کو آنے والے مہمانوں کے بارے میں بتانے لگی۔ جب تک شانزہ نے کھانا کھایا وہ اس کے لیے سائے بھی بنا کر لے آئی۔ جانتی تھی کہ یہ اس کی بہت پرانی عادت تھی دوپہر کے کھانے کے فوراً بعد چائے کا گرما بھاپ اڑاتا کپ..... اس کے لیے دوپہر کے قبلے کے برابر ہوتا تھا..... فریض ہو جاتی تھی وہ ابھی وہ دونوں باتیں ہی کر رہی تھیں کہ گیٹ پر ہوتی دستک نے

تو انہر دکار دھارے ان کے سامنے تھا۔

دونوں حیرت سے گنگ ہوئی زبان کے ساتھ پٹی پٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگیں۔ اور وہ ان دونوں کو یوں ہی ہکا بکا چھوڑ کر ان کے پاس سے گزر کر کمرے کے دروازے کے پاس کھڑی ایسی کھلی ہانپوں میں سا گیا۔ فرح اور شانزہ کا سستہ کیا ٹوٹا گویا آنکھوں سے دم جمم دم جمم سادوں برس پڑا۔ اب وہ دونوں بھی عادل کے ہاتھ تھامے روٹی آنکھوں اور مسکراتے ہونٹوں کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔

☆☆☆

آج فرح کا نکاح تھا۔

تقریب بہت سادہ طریقے سے کی جا رہی تھی کیونکہ غیب احمد کا اصرار تھا کہ سب کچھ سادگی سے ہوگا۔

البتہ کل جب شانزہ کی مایوں مہندی کی رسم ہوگی تو وہ رواجی انداز میں ہوگی تب انہیں بالکل بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا کیونکہ وہ ان کے چھوٹے بھائی حسب احمد کی پہلی خوشی ہوگی اور ان کے لیے بھی باعث مسرت۔ امی اور عادل نے ان کی ہر بات پر آمنا صدقہ کہا تھا کہ بات ان کی مناسب بھی تھی اور سوز بھی۔

اس دن عادل کی اچانک آمد نے ان تینوں کے دلوں میں گویا مسرت کا جہاں آباد کر دیا تھا۔ ہر حال پریشانی دھواں بن کر اڑ گئی تھی۔ آج گھر کے درود پوار تک مسکرا رہے تھے گویا۔ آج ان کا چھوٹا سا کنبہ ایک جگہ بچکا تھا۔ امی کا دل تو بس اسی سرور میں ڈوبا ہوا تھا۔

عادل یہ تمام عرصہ اپنے دوست کے ساتھ کرائے کا مکان شیر کر کے رہا تھا۔ چاب میں اس کی ترقی ہو چکی تھی اور وہ اب ایک کورسز اور ڈپلومہ حاصل کر چکا تھا آج کل میں ایک بہت اچھی پٹنی میں اسے چاب بھی ملنے والی تھی۔

گزرا وقت تو گزر گیا۔ اب اسے پلٹا جاسکتا تھا نہ جھکا۔ بس یوں کیا گیا کہ اس کی اچھی یادوں کو سنبھال کر یادوں کے جزدان میں لپیٹ دیا گیا اور دھکی کرنے والی باتوں کو آنسوؤں کے پانیوں میں تحلیل کر دیا گیا۔ اب دل شاد تھے۔ آنے والے لعل کے لیے امید سے

لباب بھرے ہوئے۔ یقیناً آنے والے مہمانوں کے قدم مبارک ثابت ہوئے تھے۔ وہ لوگ دیکھنے تو شانزہ کو آئے تھے مگر انہیں فرح بھی پسند آگئی۔

رضیہ بیگم اور شانزہ دونوں بہنیں میں جو والدہ کی موجودگی کی وجہ سے بھائی کے لیے لڑی دیکھنے آئی تھیں۔ شانزہ تو انہیں پہلی ہی نظر میں بھائی تھی۔ فرح کے لیے آپس میں بات کرنے کے لیے انہوں نے امی سے کچھ دیر کی تنہائی مانگی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں کیوں نہیں تم ضرور مشورہ کرو آہاں میں۔ اس میں برائے والی بھلا کون سی بات ہے۔ امی کچھ دیر کے لیے ڈرائنگ روم سے چلی گئیں۔ اور انہوں نے فرح کے لیے اپنے بڑے بھائی غیب احمد کا رشتہ بھی دے دیا۔ امی تو قدرت کی اس مہربانی پر گنگ رہ گئیں۔

”آئی۔۔۔۔۔ غیب بھائی بہت ہی سادہ مزاج اور ذمے دار انسان ہیں۔ مگر قسمت کا لکھا کون بدل سکتا ہے۔ ان کی بیوی دوسرے بچے کی پیدائش کے بعد گھر عرصہ تو مکمل ٹھیک رہی مگر ایک دن انکشاف ہوا کہ آپریشن کے دوران ڈاکٹرز نے ان کی پورٹس میں کلبہ کی رسوائی دیکھی ہے جو اپنی جڑیں اتنی تیزی سے پکڑ چکی ہے کہ اب وہ چھ ماہ سے زیادہ زندہ نہیں رہ پائیں گی۔“

شانزہ نے بھائی کے بارے میں صاف صاف ہر بات بتادی۔

”اور ان کا بچہ۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے وہ تو ٹھیک ہے نا! امی نے دھکی ہوتے ہوئے پوچھا۔

”خدا کی قدرت آئی۔۔۔۔۔ بچہ بالکل محفوظ رہا۔ رضیہ بیگم نے بھی کونکوں میں حصہ لیا۔

”آئی۔۔۔۔۔ اب آپ بتائیے فرح کے ساتھ وہ حادثہ کیوں ہوا؟“ رشتہ کرانے والی نے بس اتنا ہی بتا دیا کہ انہیں وہ طلاق یافتہ ہے۔

”بس بیٹا۔۔۔۔۔ قدرت کے کام میں ہمارا کیا دخل۔۔۔۔۔ وہ لوگ بہت بے مہرے اور ناشکرے تھے جنہوں نے میری معصوم بیٹی کی ناقدری کی۔۔۔۔۔ دو سال

اب اس لیے نکال دیا کہ ابھی تک اولاد کیوں نہیں آئی۔۔۔۔۔ بس یہ طعنہ ہی حادثے کا باعث بنا۔“ امی نے بہت سنبھل کر بتا دیا۔ یوں کہ جھوٹ بھی نہ لگے اور گنا کا بھائی تک چہرہ بھی صاف دکھائی نہ دے کہ۔۔۔۔۔ اب حال انہیں بیٹی کے لیے کوئی اور کھ خریدنا منظور نہ تھا۔ اور یوں دونوں رشتے طے ہو گئے۔ اپنے مقررہ وقت کے۔۔۔۔۔ جوان کے لیے کاتب تقدیر نے آسمانوں پر طے لگے ہوئے تھے۔

☆☆☆

”بے مروت۔۔۔۔۔ بے وفا۔۔۔۔۔ طوطا چشم۔ دیکھ لی تمہاری دوستی بھائی کے ہاتھ استغنی اور کار ڈھجوا۔ اتنا نہ اور کہ دو گھڑی گھر آ کر آپ بیٹی سنا جانی۔۔۔۔۔ کچھ میری بن جانی۔ ہا۔۔۔۔۔ کیا زمانہ آ گیا ہے آکھ اوبھل پہاڑ اور بھل۔ محترمہ چپ چپاتے مایوں بیٹھ رہی ہیں اور ہم جنوں کو خبر نہیں۔ کہاں ہے یہ بے وفا لڑکی؟“ یہ سیرا جی جو گھر میں داخل ہوتے کے ساتھ ہی شروع ہو چکی تھی۔

اندر کمرے میں مایوں کا بیٹا جوڑا بیٹھے بیٹھی شانزہ نے مسکراتے ہوئے زبان دانتوں تلے دیا۔

”آئی۔۔۔۔۔ بجائیے مجھے آج میرا تپا پیچہ کر دے گی یہ لڑکی۔۔۔۔۔ ادھر آ کر میرے آگے ڈھال بن کر بیٹھ جائیں۔“ اس نے پاس کھڑی فرح کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنے آگے بٹھا دیا۔

”ارے۔۔۔۔۔ دھیان سے گزریا میری مہندی ابھی لگائی ہے۔“ فرح نے جھٹ اپنا ہاتھ پھڑپھڑایا۔

”اوہ۔۔۔۔۔ وہ تو میری بھی لگائی ہے۔“ شانزہ نے بے ساختہ اپنا ہاتھ بھی دیکھا۔ پتہ ہوئی تھی مہندی اتنی زیادہ لگائی تھی کہ گندہ ہو جاتی۔ دونوں اپنی اپنی جگت پر مسکرا دیں۔

”اور بے فکر ہو جاؤ!۔۔۔۔۔ مہندی میری بھی لگائی ہے ابھی مگر زبان ابھی ابھی شاپ کر کے آئی۔۔۔۔۔ گانے گانے کے لیے۔“ سیرا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”تم نے کس خوشی میں مہندی لگائی ہوئی ہے ابھی

کرنے کو نور اہلکار بچھا کر کھڑی ہو گئیں۔

☆☆☆

سے پڑ شانزہ نے گھورا۔

”وہیے یار ہمارا تمہارا حساب بنتا برابر ہے۔۔۔۔۔ میں بھی تمہیں بتا ہی نہیں سکی کچھ اتنا آٹا فانا ہوا کہ میں خود بھی تک حیران ہوں۔“ وہ دھپ سے اس کے برابر آ کر بیٹھی۔

”بے ایمان۔۔۔۔۔ بے وفا۔۔۔۔۔ نور اہلکار بھی چکا دیا۔“

شانزہ نے خوشی سے بے ساختہ اس کے گال سے اپنا گال ملا لیا۔

”پرسوں مٹکی ہے میری اور یہ مہندی دو دن پہلے تمہاری فرح آئی کی مہندی کی خوشی میں لگائی ہے اماں کی ہزار صلواتوں کے باوجود۔“ اس نے خریہ ہاتھ اس کے آگے کئے۔

”ہاں بھی تم تو ہو ہی طرم خان۔“ دونوں بے ساختہ مسکرا دیں۔ اندر آئی امی نے مسکرائی نظروں سے ان تینوں کو دیکھا دل بے ساختہ ان کی خوشیوں کے داغی ہونے کے لیے دعا گو ہوا۔ اور وہ ہنسر کے موتی لٹانے اور خدا کے حضور سربسجود ہو کر اپنی عاجزی کا اعتراف کرنے کو نور اہلکار بچھا کر کھڑی ہو گئیں۔

☆☆☆